تنازعہ مسجد شہید گنج

تجزیاتی مطالعہ

محمد خورشید

لاہور ریلوے سٹیشن کے نزدیک دہلی گیٹ سے باہر لنڈا بازار میں ایک عمارت ہے جس کے بارے میں سکھ مصنفین کا دعویٰ ہے کہ اس جگہ سکھوں کو اذیتیں دی جاتی تھیں، پھانسیوں پر لٹکایا جاتا تھا اور زیرزمین دفن کر دیا جاتا تھا جبکہ سطح زمین پر یہ ایک مسجد نما عمارت تھی جس کو ۱۷۵۰ء میں منو خان نے بنوایا تھا[1]۔ لیکن مسلمان مصنفین کا دعویٰ ہے کہ یہ مسجد ۱۰۴۶ھ (۱۶۴۵ء) میں شاہ جہاں کے دور حکومت میں داراشکوہ (۱۶۱۶ء۔ ۱۶۵۹ء) کے خانساماں عبداللہ خان نے بنوائی تھی[2] لہٰذا اس کو ہر حال میں مسجد عبداللہ خان ہی کہنا چاہئیے تھا۔ جہاں تک اس کے نام شہید گنج کا تعلق ہے، گورنر یحییٰ خان کے زمانے میں جب سکھوں کی یورش حد سے بڑھ گئی تو وزیراعظم لکھپت رائے کی سربراہی میں سکھوں کی بغاوت کو فرو کیا گیا۔ تقریباً ۲ ہزار سکھوں کو قید کر کے لاہور لایا گیا اور قتل کر دیا گیا[3]۔ ایک سکھ رہنما بھائی تارو سنگھ کو گھوڑا مارکیٹ بیرون دہلی گیٹ قتل کیا گیا۔ اس کے قریب ہی یہ مسجد تھی۔ ۱۷۶۳ء میں جب سکھوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو اس مسجد پر بھی قابض ہو گئے اور اس کا نام گوردوارہ شہید گنج رکھدیا[4]۔ سکھوں نے صرف اسی کا نام گوردوارہ شہید گنج نہیں رکھا بلکہ جہاں جہاں سکھوں کا کوئی لیڈر قتل ہوا، اس جگہ کا نام بھی شہید گنج رکھ دیا[5]۔ سکھوں کے دور حکومت میں مسجد کا صحن اور دالان لنگر خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مسجد کے صحن میں لوہے کی ایک بہت بڑی کڑاہی بھنگ سے بھری ہوتی تھی جسے سکھ بڑے شوق سے پیتے تھے[6]۔

۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب کا برطانوی ہند کی حکومت سے الحاق کر لیا۔ سکھ حکومت کے خاتمے کے ایک سال بعد ۱۷ اپریل ۱۸۵۰ء کو دین محمد[7] کے پوتے نور محمد نے مسجد کے حصول کی خاطر بھائی جوان سنگھ کے خلاف دعویٰ دائر کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ نور محمد اس کے بعد ۱۸۵۳ء سے

۱۸۸۳ء تک مسجد کی بازیابی کیلئے مسلسل مقدمات دائر کرتے رہے لیکن فیصلہ ہر مرتبہ سکھوں کے حق میں ہوتا رہا۔ سکھوں کا یہ موقف تھا کہ یہ جگہ مسجد نما تھی جسے سکھ باغیوں کو سزا دینے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مزید برآں وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ یہاں ہزاروں سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا لہذا یہ جگہ سکھوں کے خون سے لبریز ہے اور ان کے لیے تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مسجد کی بازیابی کیلئے ایک کوشش اپریل ۱۸۸۳ء میں مسمی مہر شاہ امام مسجد ٹکسالی دروازہ نے، لاہور اور دیگر اضلاع پنجاب کے مسلمانوں کی حمایت سے کی۔ انہوں نے صوبائی گورنر کو ایک درخواست دی جسے گورنر نے ۲۷ اگست ۱۸۸۳ء کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ وہ اس معاملہ میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا [۸]۔ غرضیکہ مسجد کے حصول کے لیے یکے بعد دیگرے سترہ دعوے [۹] دائر کیئے گئے جن میں انجمن حمایت اسلام (۱۸۸۴ء) کی اپیل بھی شامل تھی [۱۰]۔ لیکن مسلمانوں کے تمام دعوے خارج کر دیے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں حکومت نے اعلان کر دیا کہ پرانی مسجد گوردوارہ شہید گنج بھائی تارو سنگھ کی ملکیت ہے۔ اس سے قبل ۱۹۲۵ء میں حکومت پنجاب نے سکھ گوردوارہ ایکٹ کی منظوری دے دی تھی جس کے تحت تمام سکھ گوردواروں کو سکھ مرکزی بورڈ کی تحویل میں دے دیا گیا تھا اور اس طرح شہید گنج کی یہ تمام جائیداد قانونی طور پر مقامی شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے اختیار میں آ گئی تھی [۱۱]۔ اس موقع پر ہرنام سنگھ اور اس کے بھائی گیانی ہری سنگھ نے گوردوارہ ٹریبونل کو درخواست دی کہ یہ جائیداد ذاتی ہے لہذا کمیٹی کو اس پر تصرف کا حق نہیں لیکن ٹریبونل نے اس اپیل کو خارج کر دیا۔ سکھ قابضین نے لاہور ہائی کورٹ سے رجوع کیا۔ دسمبر ۱۹۳۴ء کو ہائی کورٹ نے بھی اپیل نامنظور کر دی اور ضابطے کی ضروری کارروائی کی تکمیل کے بعد مارچ ۱۹۳۵ء میں یہ عمارت شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی مقامی شاخ کے حوالے کر دی [۱۲]۔

۸ جون ۱۹۳۵ء کو شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے بازار کی شمالی جانب دیوار بنانا شروع کی جسکی بنا پر مسجد کے کچھ حصے کا انہدام ناگزیر ہو گیا [۱۳]۔ درحقیقت سکھ عمارت کے اسلامی نقوش مٹانے کی غرض سے پہلے ہی مسجد کو شہید کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھے لہذا جب انہدام کا کام شروع ہوا تو مسلمانوں نے احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا اور ۲۸ جون ۱۹۳۵ء کو مسلمانوں کا ایک بڑا ہجوم ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے مسجد شہید گنج کے گرد جمع ہو گیا۔ اسی روز ایک سکھ معمار میلا سنگھ

کسی بوسیدہ دیوار کو گراتے ہوئے ملبے تلے دب کر ہلاک ہو گیا۔ یہ خبر اخبارات میں چھپی اور یہ بات مشہور ہو گئی کہ اس معمار نے اللہ کے گھر کو گرانے کا ارادہ کیا تھا جس کی اسے یہ سزا ملی۔ اگلے روز مسلمان پھر بڑی تعداد میں مسجد کے باہر جمع ہو گئے اور سٹی مجسٹریٹ سردار نریندر سنگھ کو مجمع کو منتشر کرنے کے لیے خود مداخلت کرنا پڑی [۱۴]۔ ۲ جولائی ۱۹۳۵ء کو صبح ساڑھے دس بجے ۲۰۰ مسلح رضاکاروں نے مسجد کی طرف فوجی انداز میں بڑھنا شروع کیا۔ ان رضاکاروں کے ہمراہ تقریباً ۳۰۰۰ مسلمانوں کا ایک جلوس بھی تھا [۱۵]۔ صورتحال کو مزید بگڑنے سے بچانے کیلئے ڈی۔ ایس پرتاپ سنگھ اور سٹی مجسٹریٹ نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ جب تک حکومت پنجاب مسجد کے بارے میں کوئی پالیسی وضع نہ کرلے اس وقت تک سکھوں کو مسجد کی ایک اینٹ بھی نہیں گرانے دی جائے گی [۱۶]۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیداران کی جانب سے یہ ایک بڑی یقین دہانی تھی لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے آٹھ عمائدین [۱۷] شہر پر مشتمل ایک وفد ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجا۔ چونکہ سکھ رضاکاروں کے جتھے جو اوائل جون سے آنے شروع ہوئے تھے وہ مسلسل نہ صرف متنازعہ عمارت میں جمع ہو رہے تھے بلکہ ان کا طرز عمل بھی انتہائی اشتعال انگیز تھا، شہری انتظامیہ نے وفد کی تسلی کرائی اور یقین دلایا کہ مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور نہ ہی آئندہ کسی قسم کا نقصان پہنچنے دیا جائے گا [۱۸]۔ اسی دن ڈپٹی کمشنر لاہور نے باقاعدہ پریس نوٹ جاری کیا جس میں سکھوں کے جتھوں کی آمد کا تذکرہ اور مسجد اور گوردوارے کی حفاظت کا عزم ظاہر کیا گیا تھا [۱۹]۔ حکومت کے اس اعلان کے باوجود سکھ جتھوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور انکی تعداد تقریباً ۴ ہزار ہو گئی [۲۰]۔ بات یہاں تک محدود نہ تھی۔ خود سکھوں کی مذہبی قیادت بھی نہایت غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز بیانات دے رہی تھی [۲۱]۔ جبکہ حکومت کے اہل کار حتیٰ کہ گورنر ہربرٹ ایمرسن تک اس مسئلے کو سلجھانے کی بجائے مزید الجھانا چاہتے تھے [۲۲]۔

ان حالات میں مسلم رہنماؤں نے یہ طے کیا کہ محض حکومت کے وعدوں پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ عملی اقدامات بھی اٹھائے جائیں لہٰذا اس مقصد کے لیے ۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۵۶ء) کی زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں درج ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

۱۔ ہرگاہ کہ مسجد شہید گنج واقع لنڈا بازار لاہور مسلمانوں کا ایک وقف ہے ۔ سکھ اس کو منہدم کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں ۔ مسلمانان لاہور کا جلسہ سکھوں کے اس طرز عمل کے خلاف پرزور صدائے احتجاج بلند کرتا ہے اور حکومت برطانیہ پر زور دیتا ہے کہ وہ مسجد کے انہدام کو روکنے کو یقینی بنائے اور مسجد اس کے جائز متولیوں یعنی لاہور کے مسلمانوں کے حوالے کردے

۲۔ مسلمانان لاہور کا یہ عظیم جلسہ ڈی ۔ سی لاہور کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے مسجد کو بروقت انہدام سے بچانے کیلئے بعض اہم عارضی انتظامات کئے ۔

۳۔ مسلمانان لاہور کا یہ جلسہ مسٹر فرخ حسین بیرسٹر، خواجہ غلام مصطفےٰ نائیک ایڈوکیٹ، سید محسن شاہ ایڈوکیٹ، سید حسین جعفری اور شیخ قمرالدین پلیڈر کو مقرر کرتا ہے اور اس کی کامل اجازت دیتا ہے کہ وہ مسجد سے متعلق استغاثہ کی پیروی کریں ۔

۴۔ یہ جلسہ حکومت پر زور دیتا ہے کہ جس طرح سکھوں کو اپنی حفاظت کیلئے کرپان رکھنے کی اجازت ہے اسی طرح مسلمانوں کو تلوار رکھنے کی اجازت دے ۔ [۲۳]

ان قراردادوں کے علاوہ اس مسئلے کے بارے میں حکومت کے ذمہ داران تک اپنا نقطہ نظر پہنچانے، قانونی مواد اکٹھا کرنے، سکھ رہنماؤں سے گفتگو کرنے، گرفتار شدگان کی ضمانت کرانے، عوام پر اس مسئلے کی اہمیت واضح کرنے اور ان تمام امور کے لیے سرمایا اکٹھا کرنے کے لیے کمیٹیاں تشکیل دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔چنانچہ اسی روز میاں عبدالعزیز مالواڈہ (۱۸۷۲ء۔۱۹۷۰ء) بار ایٹ لاء کے مکان پر مختلف طبقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیت کا اجتماع ہوا جس میں بالاتفاق یہ طے پایا کہ "انجمن تحفظ مسجد شہید گنج لاہور" تشکیل دی جائے جس میں کچھ سرکردہ مسلم یونینسٹ مختلف برادریوں کے سربراہ، اعتدال پسند وکلاء اور صحافی شامل ہوں نیز درج ذیل کمیٹیاں ترتیب دی گئیں :۔

۱۔علماء کمیٹی تشکیل دی گئی تاکہ:

i ۔ اس مسئلے کے شرعی پہلو کی وضاحت کی جائے ۔

ii ۔ مسجد سے متعلق دستاویزات اکٹھی کی جائیں ۔

ملک محمد اسلم بیرسٹر اس کے کنوینر مقرر کیے گئے جبکہ مولانا سید محمد احمد، میاں عبدالعزیز بیرسٹر، مولانا غلام مرشد اور مولانا غلام نورالحق اس کے ممبر تھے ۔اس کمیٹی کے تحت ایک ذیلی کمیٹی

تشکیل دی گئی جس کے کنوینر سید محمد علی جعفری تھے جبکہ مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، قاضی حبیب اللہ، سید محسن شاہ اور قاضی احسان اللہ مدیر زمیندار اس کے ممبر تھے۔

۲۔پبلک مظاہرہ ذیلی کمیٹی بنائی گئی جس کے داعی مولانا ظفر علی خان تھے جبکہ اس کے ممبران میں مولانا منور خان ساغر، میر محمد الدین، خان ایاز خان، شیخ قمر الدین، عبدالحیٔ بیرسٹر، سید حسن جعفری، مولانا عبدالحنان، فیروز الدین احمد میونسپل کمشنر، مولانا داؤد غزنوی، پیر محمد شاہ اور ملک محمد عمر خان شامل تھے۔

۳۔پراپیگنڈا کمیٹی کے کنوینر میاں فیروزالدین احمد کمشنر میونسپل کمیٹی لاہور تھے جبکہ مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب، مولوی فیروز الدین مالک ایسٹرن ٹائم، مولانا سید حبیب، پیر تاج الدین بیرسٹر، ملک محمد اسلم بیرسٹر، میاں محمد رفیق خالد مدیر استار، چودھری غلام حیدر، آقائے غلام مرتضےٰ احمد میکش مدیر احسان، قاضی احسان اللہ مدیر زمیندار اس کے ممبر تھے۔

۴۔سکھ لیڈروں سے مذاکرات کی کمیٹی بنائی گئی جس کے سربراہ مولانا ظفر علی خان تھے، جبکہ مولانا سید حبیب خان، میاں امیرالدین، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر محمد عالم اور چودھری افضل حق اس کے ممبر مقرر کیے گئے۔

۵۔ذمہ داران حکومت سے مذاکراتی کمیٹی کے کنوینر سید محسن شاہ بنائے گئے جبکہ ڈاکٹر شجاع الدین بیرسٹر، خواجہ غلام مصطفیٰ نائیک، میاں عبدالعزیز بیرسٹر، مولانا غلام محی الدین اور مولانا اختر علی خان اس کے ممبر بنائے گئے۔

۶۔آخری کمیٹی سرمایہ ذیلی کمیٹی تھی جس کے کنوینر سید محمد جعفری تھے اور ممبران میں میاں عبدالعزیز، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین بیرسٹر، خان صاحب امیرالدین، نواب محمد شاہ نواز ممدوٹ، نواب نثار علی قزلباش، مولانا ظفر علی خان، سید حبیب شاہ، نواب احمد یار دولتانہ، مولانا محمد داود غزنوی، سید احمد علی شاہ اور میاں فیروزالدین شامل تھے۔

۷۔اسی اجلاس میں ایک جنرل کونسل تشکیل دی گئی۔ تمام کمیٹیوں کے ممبران اس کے ممبر قرار دیے گئے جبکہ اس کے صدر نواب محمد شاہ نواز ممدوٹ اور سیکرٹری مولانا ظفر علی خان بنائے گئے[۲۴]

"انجمن تحفظ مسجد شہید گنج" نے اپنی عملی سرگرمیوں کا آغاز ۶ جولائی ۱۹۳۵ء کو موچی دروازے پر ایک جلسہ کے انعقاد سے کیا۔ جس میں تقریباً ۷۰ ہزار افراد نے شرکت کی[25]۔ اس ضمن میں ایک وفد اسی روز زیر قیادت نواب آف ممدوٹ گورنر پنجاب سے ملا اور یہ تجویز پیش کی کہ مسئلے کو بحسن و خوبی حل کرنے کے لیے حکومت شہید گنج کی عمارت سکھوں سے خرید کر محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دے۔ گورنر نے اس امر پر غور کرنے کا وعدہ کیا بلکہ یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ وہ دونوں فرقوں میں صلح کرانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے گا[26]۔ اس امر کا بھی فیصلہ کیا گیا کہ مسجد کے انہدام کو روکنے کے لیے حکم امتناعی حاصل کیا جائے۔ یہ کام مولانا اختر علی خان کے سپرد ہوا لیکن وہ سردار سرپندر سنگھ کی ضمانت پر اعتبار کر بیٹھے[27]۔ سکھ رہنماؤں سے گفتگو کی کمیٹی نے سکھ لیڈروں سے گفتگو کی۔ سکھوں نے اس بارے میں یہ وعدہ کیا کہ جب تک شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی مسلمانوں کی اس تجویز (عمارت محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں دے دی جائے) پر اچھی طرح غور نہیں کرے گی اس وقت تک مسجد مسمار نہیں کی جائے گی[28]۔ لیکن سکھ رہنماؤں اور گورنر کی واضح یقین دہانیوں کے باوجود سکھوں نے ۸ جولائی کو آدھی رات سے قبل مسجد کو شہید کرنا شروع کر دیا اور صبح ہونے تک کام تمام کر دیا۔ اس موقع پر برطانوی ہند کی سول انتظامیہ کی "مستعدی" دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ مسجد کے شہید کیے جانے میں کم از کم صوبائی انتظامیہ کی خاموش تائید و حمایت ضرور شامل تھی، جس شخص نے سب سے پہلے مسجد کے گنبد پر گینتی چلائی وہ سی۔آئی۔ڈی کا سب انسپکٹر بنتا سنگھ تھا اور اس کے ہمراہ سادہ لباس میں چند سپاہی بھی تھے[29]۔ عجب بات یہ ہوئی کہ مسجد کے انہدام سے قبل حکومت نے مسجد کے چاروں اطراف مسلح فوج اور پولیس متعین کر دی تاکہ مسلمان سکھوں کے اس فعل میں مداخلت نہ کر سکیں۔ گویا مسجد کا انہدام فوج اور پولیس کی نگرانی میں ہوا[30]۔

مسجد کی شہادت مسلمانوں کے لیے ایک غیر متوقع سانحہ تھا۔ اور ان میں ہیجان پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ تقریباً دس ہزار افراد کا جم غفیر جسمیں ایک ہزار نیلی پوش (بلیو شرٹ) مجاہدین بھی شامل تھے، حکومت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنے کیلئے لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مسلح مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ انتظامیہ پہلے ہی بہت چوکس تھی، دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی اور پھر کرفیو کے

احکامات صادر کر دیے گئے۔اس کے علاوہ ان راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی جو مسجد شہید گنج کی طرف جاتے تھے۔حکومت نے چھاؤنی سے گورا فوج کی دو پلٹنیں بلا کر شہید گنج کے آس پاس متعین کر دیں، اس کے علاوہ ڈپٹی کمشنر لاہور نے سید حبیب مدیر سیاست، مولانا ظفر علی خان اور ان کے فرزند مولانا اختر علی خان کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کو اشتعال دلانے کی کوشش کی تو ان کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی [۳۱]۔۹ جولائی کو میاں عبدالعزیز کے مکان پر جلسہ ہوا جس میں سکھوں کے اس طرز عمل کی مذمت کی گئی۔انگریز انتظامیہ کی صریح وعدہ خلافی پر اظہار افسوس کیا گیا۔۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء بروز جمعہ موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں شہید گنج کے حصول کیلئے رضاکاروں کی بھرتی کا اعلان کیا گیا۔اس جلسے سے مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، ملک لال خان اور میاں فیروز الدین کے علاوہ ایک سکھ لیڈر بہادر سنگھ نے بھی خطاب کیا۔اس جلسے میں "انجمن تحفظ مسجد شہید گنج" توڑ کر "مجلس مرکزیہ عدلیہ تحفظ مساجد و اوقاف" قائم کی گئی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس طرح گوردوارہ ایکٹ بنا ہے اسی طرح مساجد ایکٹ اور وقف ایکٹ بنایا جائے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سردار بہادر سنگھ نے بھی مذموم فعل کی مذمت کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مسجد کے مینارے دوبارہ تعمیر ہوں [۳۲]۔حکومت نے اسی روز رات کو صف اول کے تمام رہنما نظر بند کر دیئے جن میں مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، فیروز الدین اور ملک لال خان شامل تھے جلسے میں جو تیز و تند تقریریں ہوئیں ان سے عوام کے جذبات مزید مشتعل ہو چکے تھے اور قائدین کی گرفتاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا یہ ایک نہایت خطرناک صورتحال تھی۔مشتعل جذبات سے لبریز شوق شہادت سے سرشار انسانوں کا جم غفیر لیکن بے قیادت!! نتیجہ یہ نکلا کہ احتجاجات کا ایک لامتناہی اور بے قابو سلسلہ چل نکلا۔پورا صوبہ اور اس کا ہر گاؤں اور ہر قریہ احتجاج کی لپیٹ میں آگیا۔ ۱۵ اور ۱۶ جولائی کو مسلمانوں کے ہجوم اکٹھے ہوئے۔انہیں خلاف قانون قرار دے کر منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔تعمیل نہ کرنے پر شدید لاٹھی چارج ہوا۔۱۹ جولائی بروز جمعہ جلسہ بادشاہی مسجد میں رہی سہی کسر مولانا اختر علی خان کے بیان نے پوری کر دی۔انہوں نے اپنے والد محترم مولانا ظفر علی خان سے منسوب ایک جذبات انگیز پیغام مسلمانوں کو دیا کہ کعبہ کی بیٹی کی بے حرمتی سکھوں کی کدالوں سے ہوئی ہے۔اب اس کی ناموس پکار پکار کر بلا رہی ہے [۳۳]۔اس پیغام نے مسلمانوں کے

جذبات میں آگ لگادی اور انہیں عقل و خرد سے بیگانہ کر دیا۔ نہتے مسلمان حکومت برطانیہ کی مسلح افواج اور سکھوں کی کرپانوں کی ہلاکت آفرینی سے بے نیاز ہو کر شہید گنج کی طرف چل پڑے۔ چند نوجوان جن میں شورش کاشمیری، غازی محمد اسحاق، حفیظ قندھاری پیش پیش تھے جلسوں میں جذباتی تقاریر کرتے رہے۔ امین الدین صحرائی کا نعرہ "شہید گنج چلے چلو مسجد لو یا موت لو" بہت مقبول ہوا۔

دہلی دروازے کے باہر ایک جنگلہ جلوس کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا جنگلے کے دوسری طرف پولیس اور فوج تھی، ہجوم جم کر وہیں بیٹھ گیا اور رات بھر بیٹھا رہا۔ وہیں نمازیں ادا ہوئیں اور جذباتی تقاریر کا سلسلہ جاری رہا۔ پولیس نے امین الدین صحرائی کو گرفتار کرلیا۔ اس پر زبردست معرکہ ہوا۔ پولیس نے فائر بریگیڈ منگوا کر منوں پانی پھنکوایا۔ سینکڑوں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ لیکن مجمع جوں کا توں جما بیٹھا رہا۔ عشاء کی نماز سڑک پر ہی ادا کی گئی۔ سرجن سنگھ کے چوک سے لیکر نوگزے کی قبر تک پون میل میں نمازیوں کی صفیں بندھی ہوئی تھیں۔ مشہور قاری حافظ محمد یعقوب نے نماز پڑھائی۔ رکعتیں اتنی لمبی کر دیں کہ نصف قرآن پڑھ ڈالا۔ پولیس عاجز آگئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ مجمع کی پشت پر شہر میں رت جگا ہو رہا تھا کرفیو کے احکامات سخت کر دیئے گئے تھے لیکن شہر میں کوئی قانون نہ تھا۔ بازاروں میں رات کے وقت دن سے زیادہ چہل پہل تھی۔ مجاہدین کے لئے دیگیں پک رہی تھیں۔ اگلے روز اس مجمع پر لاٹھی چارج ہوا۔ بار بار پانی پھینکا گیا لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود مجمع اپنی جگہ پر ڈٹا رہا بلکہ دوسرے مقامات سے بھی مسلمانوں کے ہجوم کوتوالی آنے کی کوشش کرتے رہے، اور پولیس ہر ممکن طریقے سے ان کو روکنے کے لیے کوشاں رہی۔ مشہور سیاسی شخصیت اور اس قضیے میں سزا پانے والے مشہور مؤرخ شورش کاشمیری آنکھوں دیکھا حال کچھ اس طرح سے تحریر کرتے ہیں:

> ایمرسن روڈ سے ریلوے روڈ اور ریلوے روڈ سے لنڈا بازار جدھر نگاہ اٹھتی پولیس تھی یا فوج۔ دہلی دروازے کے باغ میں فوج نے باقاعدہ ڈیرے ڈالے ہوئے تھے کوتوالی سے یکی دروازے اور مصری شاہ کے پل تک۔ ادھر دہلی دروازے سے لنڈا بازار کے آخری نکڑ تک گورے سپاہی ٹکڑیوں میں بٹ کر کھڑے تھے اور ان کی سٹین گنوں کے رخ مظاہرین کی طرف تھے۔

لیکن نوجوانوں کے حوصلوں کا یہ عالم تھا کہ دو روز سے سینہ تان کے کھڑے اور باری باری گولی کھا کے شہید ہو رہے تھے ------ شہر کے اندر سے فلک شگاف صدائیں لگا تار آرہی تھیں۔ یا پھر گولیوں کی سنسناہٹ تھی کہ غریب مسلمان ماؤں کے غیرت مند شہید ہو رہے تھے اور انہیں اس حالت میں تیسرا دن ہو گیا تھا۔ اکثر گورے اور ان کے دیسی سپوت جن میں فرزندان اسلام بھی تھے سروں پر پٹیاں باندھے زخم کھائے لہولہان نظر آرہے تھے دہلی دروازے کے سامنے حشر کا سماں تھا نوجوان کفن باندھے کھڑے تھے ایک ہی نعرہ اللہ اکبر۔ فوجی گورے شست باندھے کھڑے تھے۔ نوجوان آگے بڑھتا۔ ایس پرتاپ حکم دیتا اور وہ کلمہ شہادت پڑھتا وہیں شہید ہو جاتا [۳۴]۔

صورتحال کی سنگینی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود انگریز انتظامیہ کے ذمہ دار رکن بوائیڈ (Boyd) نے مسجد شہید گنج کے تنازعے پر بحث کے دوران پنجاب اسمبلی میں اس بات کا اعتراف کیا کہ دو دنوں میں مسلمانوں پر دس مرتبہ گولی چلائی گئی [۳۵] اسی ہیجان خیزی میں تیسرے روز یعنی ۲۱ جولائی بروز اتوار کی دروازے پر موجود مظاہرین نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا۔ انہوں نے انفرادی طور پر حصول شہادت کے عمل کو اجتماعی رنگ دے دیا وہ درجنوں کی تعداد میں کفن پہن کر کھڑے ہو گئے ان کی دیکھا دیکھی دہلی دروازے میں بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ بزازوں نے دوکانوں کی دوکانیں خالی کر دیں۔ اس صورتحال سے گورنر تک کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ فوراً کوتوالی پہنچا۔ کاسہ لیس بھی حاضر ہوئے لیکن وہ بے وقعت تھے۔ گورنر نے بالآخر مولانا اختر علی خان کو بلوایا اور اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ لوگوں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیں۔ لہٰذا انہوں نے احتجاجیوں کو اپنے والد محترم کا ایک فرضی پیغام دیا کہ " محاذ کو توڑ دو۔ صورتحال بہتر ہو رہی ہے اس طرح قیمتی خون بہانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا "۔ [۳۶] مولانا اختر علی خان کے اس پیغام میں اتنی قوت تھی کہ حکومت کی تین یوم کی مسلسل جستجو اور تمام تر قوت کے باوجود محاصرہ ختم نہ ہو سکا وہ آن واحد میں ختم ہو گیا۔ مظاہرین نے مورچہ تو ختم کر دیا لیکن احساس شکست نے ان پر مایوسی و قنوطیت طاری کر دی۔ انہوں نے اپنے سینے انگریز فوج کی بندوقوں کے سامنے وا کر دیئے تھے۔ حکومتی دباؤ کو پرکاہ کی حیثیت بھی نہ دی تھی لیکن سب کچھ لاحاصل رہا۔ مولانا ظفر علی خان اور ان کے ساتھی نظر بند تھے۔ جوشیلے نوجوانوں کو عقوبت خانوں میں ٹھونس دیا گیا تھا اور عام مظاہرین حیران و سرگرداں تھے۔ شہید گنج پر سکھوں کا قبضہ ان کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ قیمتی جانوں کی

قربانیوں کے رائیگاں جانے کا احساس ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے ۲۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو مسجد وزیر خان میں اجلاس منعقد کیا اور تحریک سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ فیروز خان نون (۱۸۹۳ء۔ ۱۹۷۰ء) نے جو حکومت اور مسلمانوں کے درمیان رابطے کا کام کر رہے تھے، مسلمانوں کے اس فیصلے پر عدم اطمینان کا اظہار کیا کیونکہ فیروز خان نون اور دیگر یونینسٹ قائدین کے خیال کے مطابق وہ اس طرح انگریز حکومت کی خوشنودی سے محروم ہو رہے تھے[۳۷]۔

مسجد شہید گنج کے قضیے پر غور و خوض کے لیے ۳۱ اگست ۱۹۳۵ء کو سرکردہ مسلمانوں کی ایک کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہوئی جس میں صوبہ پنجاب اور سرحد سے ساٹھ مندوبین نے شرکت کی خاکسار تحریک کے قائد علامہ عنایت اللہ مشرقی (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۶۳ء) نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جس کی صدارت پیر جماعت علی شاہ[۳۸] (۱۸۴۰ء۔ ۱۹۵۱ء) نے کی، مولانا محمد اسحاق مانسہری کی جانب سے پیش کردہ سول نافرمانی کی تجویز کی منظوری کی سفارش علامہ مشرقی نے کی جبکہ مولانا اختر علی خان نے اس کی تائید کی۔ اسی اجلاس میں پیر جماعت علی شاہ اور مولانا محمد اسحاق کو بالترتیب اس تحریک کا صدر اور نائب صدر مقرر کیا گیا۔ اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو "یوم شہید گنج" منایا جائے گا اور سول نافرمانی کے بارے میں پروگرام پیش کیا جائے گا[۳۹]۔ پیر جماعت علی شاہ کے امیر مقرر کئے جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ اس تحریک کو پیر فضل شاہ، پیر غلام محی الدین اور سید زین العابدین گیلانی کی تائید و حمایت حاصل ہو گئی جبکہ لاہور کے بریلوی علماء نے بھی حمایت کا اعلان کیا[۴۰]۔ جذباتی مسلمان عمومی طور پر پیر جماعت علی شاہ کی اس تقرری سے بہت پرامید ہوئے اس لیے کہ ان کے خیال میں اس قیادت سے مذہبی اور سیاسی اعتبار سے شہید گنج کی تحریک کو دیہی علاقے کے مسلمان کی تائید و حمایت حاصل ہونے کی امید تھی جس سے وہ ابھی تک محروم تھے۔ دوسری جانب اس نئی صورتحال سے گورنر پنجاب بہت پریشان ہوئے اور ۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کو اس نئی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے اعلیٰ افسران کا اجلاس طلب کیا جس میں اخبارات اور تحریک کے قائدین کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کو خالد لطیف گابا، مولانا سید مرتضیٰ، مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۳۸ء) ڈاکٹر ضیاء الدین (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۴۷ء) اور عبدالمتین چودھری (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۴۹ء) پر مشتمل ممبران اسمبلی

کے ایک وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی ۔ وفد نے سارا معاملہ وائسرائے کے گوش گزار کیا اور درج ذیل مطالبات کئے:

۱۔ تمام گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے۔

۲۔ مقتولین اور مجروحین کے ورثاء کو معاوضہ ادا کیا جائے۔

۳۔ مسجد کو اس وقت تک ایسے ہی برقرار رکھا جائے جب تک مسلمانوں کی طرف سے پیش کردہ قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

۴۔ خود حکومت کوئی ایسا بل پیش کرے یا کسی ممبر کو پیش کرنے دے جس سے آئندہ کسی مسجد یا وقف شدہ جائیداد کے متعلق کوئی جھگڑا نہ ہو سکے۔

۵۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کے ضمن میں اخبارات یعنی احسان ۔ زمیندار اور سیاست سے جو ضمانتیں مانگی گئی تھیں انہیں منسوخ کیا جائے۔

لیکن اس ملاقات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تاہم وائسرائے لارڈ ارون، گورنر پنجاب سے بہت نالاں تھا اور اس قضیے کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتا تھا۔ پروگرام کے مطابق مجلس اتحاد ملت [۴۱] (یکم ستمبر ۱۹۳۵ء) کے زیر انتظام ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو پورے صوبے میں "یوم شہید گنج" منایا گیا اور لاہور کے مسلمانوں نے مکمل ہڑتال کی ۔ پیر جماعت علی شاہ نے موچی دروازہ لاہور پر منعقد کئے جانے والے جلسے کی صدارت کی جس میں تقریباً ساٹھ ہزار افراد نے شرکت کی [۴۲]۔ اس موقع پر مولانا شوکت علی نے ماسٹر تارا سنگھ کو مسجد شہید گنج کے قضیے سے متعلق گفتگو کی دعوت دی ۔ دونوں قومیتوں کے رہنماؤں کے درمیان ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو امرتسر کے مقام پر گفتگو ہوئی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا، لہذا ۲۳ اکتوبر کو سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے اس موقع پر پیر جماعت علی شاہ نے مسلم قائدین اور علماء کا مشترکہ اجلاس برکت علی ہال میں ۹ نومبر ۱۹۳۵ء کو منعقد کیا ۔ اس اجلاس میں مسجد کی بازیابی کے لیے دس لاکھ مجاہدین پر مشتمل ایک فورس تیار کرنے اور اس ضمن میں اٹھنے والے اخراجات کے لیے فنڈ جمع کرنے کا فیصلہ کیا گیا جبکہ مجاہدین کی بھرتی کیلئے مجلس اتحاد ملت کے تحت پورے پنجاب میں بھرتی کے مراکز قائم کئے گئے [۴۳] ۔ ۱۷ جنوری ۱۹۳۶ء کو پیر جماعت علی کی کوشش سے ایک کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا، جس میں سید حبیب اور فیروز الدین احمد نے اہم کردار ادا کیا لیکن اس کے فوراً بعد پیر جماعت علی شاہ جنوبی ہندوستان

کے دورے پر چلے گئے اور مجلس اتحاد ملت کی باگ ڈور مولا بخش، شیخ غلام محی الدین امرتسری، صاحبزادہ غلام ربانی، ابو سعید انور اور یعسوب الحسن جیسے انتہا پسند افراد کے ہاتھوں میں چلی گئی [۴۴]۔ اس طرح چند ہی یوم میں ایک غیر معروف مجاہد مولا بخش نے اپنی جذباتی تقاریر کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہوئے اس تحریک کو موثر بنانے کے لیے ایک فعال کردار ادا کیا۔ اس نے اپنی اس تحریک کا آغاز بادشاہی مسجد سے کیا۔ مسلمانان لاہور دو دو چار چار کی ٹولیوں میں باہر نکلتے اور شہید گنج کی طرف بڑھتے تھے انہیں پولیس گرفتار کر لیتی اس طرح سینکڑوں نہیں ہزاروں رضاکار جیلوں میں چلے گئے اور حکومت کیلئے نقص امن کا خطرہ پیدا ہو گیا لہذا ۳ فروری ۱۹۳۶ء کو پولیس بادشاہی مسجد میں داخل ہوئی اور مولا بخش کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی غیر حاضری میں یعسوب الحسن نے تحریک کی قیادت سنبھالی اور بادشاہی مسجد میں جوشیلی تقاریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو تشدد کی راہ اختیار کرنے کی ترغیب دی ۔ جہاں تک مولا بخش کا تعلق ہے اسے مستقبل میں بہتر طرز عمل اختیار کرنے کے وعدے پر رہا کر دیا گیا لیکن رہا ہونے کے بعد اس نے دوبارہ تحریک میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا، غرضیکہ مولا بخش اور یعسوب الحسن کی بادشاہی مسجد میں موجودگی حکومت کے لیے تشویش کا سبب تھی لہذا ۱۱ فروری ۱۹۳۶ء کو پولیس دوبارہ مسجد میں داخل ہوئی اور دونوں مجاہدین کو گرفتار کر لیا [۴۵]۔

اس موقع پر جبکہ اعلیٰ قیادت اور پرجوش و باعمل نوجوان پس دیوار زنداں بھیج دیئے گئے تو حکومت نے اس تحریک کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنے بعض گماشتوں کو آگے بڑھایا اور حصول مسجد کے تنازعے کے سلسلے میں اپنی مرضی کا پلیٹ فارم تشکیل دینے کا ایک باقاعدہ منصوبہ مرتب کیا اگرچہ مجلس اتحاد ملت کی تشکیل محض حصول مسجد شہید گنج کے لیے عمل میں لائی گئی تھی اور پیر جماعت علی شاہ کو امیر ملت مقرر کیا گیا تھا لیکن اس نے پیر صاحب کی زیر نگرانی وہی کچھ کیا جو اس کے قیام کے اصل مقاصد میں شامل تھا۔ اگر اس جماعت کی کارکردگی کا عمیق جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بہت سے منصوبے تو بنائے گئے لیکن ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدام نہ کیے گئے [۴۶]۔ اس وقت پیر جماعت علی شاہ کے علاوہ میر مقبول، کرم الہیٰ سیالکوٹی، ڈاکٹر شیخ محمد عالم اور خان بہادر سید بڈھے شاہ [۴۷] مجلس اتحاد ملت کے سرکردہ اراکین میں شامل تھے۔ ان سب نے

مل کر معاملے کو طول دیا تا کہ تحریک کی بجھی ہوئی آگ میں اگر ابھی کچھ چنگاریاں موجود ہیں تو وہ بھی دم توڑ دیں، چنانچہ جب یہ کام ہو گیا تو پیر صاحب نے اتحاد ملت کی مجلس عاملہ کا اجلاس سید بڈھے شاہ کی رہائش گاہ پر منعقد کیا اور پھر بحث و تمحیص کے بعد حج کے بلاوے کا ذکر کرتے ہوئے تحریک کے فی الحال ملتوی کرنے کا اعلان کیا اور خود حج کی تیاری میں لگ گئے۔ [۴۸]

اس موقع پر ایک جانب خالد لطیف گابا نے قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) سے درخواست کی کہ وہ شہید گنج کے قضیے کو حل کرانے کی خاطر لاہور تشریف لائیں جبکہ دوسری جانب گورنر پنجاب ہربرٹ ایمرسن نے ہنری کریک کو جو گورنر جنرل کی انتظامی کونسل کے رکن تھے مامور کیا کہ وہ قائداعظم سے ملاقات کریں اور انہیں مسلمانوں کو سمجھانے بجھانے کیلئے لاہور تشریف لانے کی دعوت دیں۔ ۱۱ فروری ۱۹۳۶ء کو قائداعظم نے لاہور جانے پر آمادگی کا اظہار کیا اور ۲۱ فروری کو آپ قضیے کا حل تلاش کرنے کے لیے لاہور پہنچے۔ سب سے پہلے گورنر سے گفت و شنید کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ تمام گرفتار شدگان رہا کر دیئے جائیں اور یہ کہ مسلمان مسجد کی بازیابی کے لیے آئینی جدوجہد کریں گے لہٰذا تمام قیدی رہا کر دیئے گئے پولیس نے اپنے روایتی انداز کے تحت چند انقلابی نوجوانوں کو رہا کرنے سے گریز کیا لیکن قائداعظم کی مداخلت پر ان کو بھی رہا کر دیا گیا [۴۹]۔ اس کے بعد قائداعظم نے سکھ لیڈروں سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ہم وطنی کا خیال کرتے ہوئے جذبہ مصالحت کے تحت مسلمانوں کے ساتھ کوئی معقول سمجھوتہ کر لیں۔ سکھوں نے آپ کی گفتگو کو بڑے غور و خوض سے سنا۔ حتیٰ کہ وہ انہیں شہید گنج دکھانے کے لیے لے گئے حالانکہ وہ تو شہید گنج کے پاس سے کسی مسلمان کا گزرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے [۵۰]۔ لیکن سکھوں کی ہٹ دھرمی کے سبب وہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان سمجھوتے کی صورت پیدا کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ نے شہید گنج مصالحتی بورڈ کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) مولانا عبدالقادر قصوری، میاں عبدالعزیز، راجہ نریندر ناتھ، پنڈت نانک چند، سردار بوٹا سنگھ، سردار اجل سنگھ، سردار سمپورن سنگھ بطور ممبر شامل تھے جبکہ میاں احمد یار دولتانہ کو اس کا کنوینر مقرر کیا گیا [۵۱]۔ اس کے بعد قائداعظم ۷ مارچ ۱۹۳۶ء کو واپس دہلی تشریف لے گئے۔ قائداعظم کی ان کوششوں سے صوبے کی مسموم فضا کو بہتر بنانے میں بہت مدد ملی جسے سرکاری اور

غیر سرکاری پریس نے واضح اور کھلے لفظوں میں تسلیم کیا[۵۲]۔

سول نافرمانی کی اس تحریک کے دوران شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کے زیر اہتمام ڈسٹرکٹ جج لاہور، مسٹر سیل کی عدالت میں ڈاکٹر محمد عالم اور ملک برکت علی (۱۸۸۵ء-۱۹۴۶ء) نے دعویٰ دائر کیا تھا جس میں یہ استدلال اختیار کیا گیا تھا کہ شریعت کے مطابق اگر کسی عمارت کو ایک مرتبہ مسجد قرار دے دیا جائے تو وہ قیامت تک مسجد ہی رہتی ہے۔ اور کسی بھی اتھارٹی کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ اس میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکے۔ لہذا مسجد شہید گنج مسلمانوں کو واپس دلائی جائے تاکہ وہ وہاں فرائض مذہبی ادا کر سکیں۔ کیونکہ متعلقہ فریقین اس دعویٰ کے فیصلے کے منتظر تھے لہذا قائداعظم کا قائم کردہ مصالحتی بورڈ زیادہ توجہ حاصل نہ کر سکا۔ ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کو اس دعویٰ کا فیصلہ سنایا گیا۔ مسٹر سیل نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ عام جائیداد غیر منقولہ کی طرح مسجد بھی فریق ثانی کے مخالفانہ قبضہ میں جا کر اپنی اصل حیثیت ختم کر بیٹھتی ہے اس لیے سکھوں کا مسجد پر قبضہ ازروئے قانون درست ہے۔[۵۳] عدالت کے اس فیصلے سے ایک مرتبہ پھر انتشار کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس وقت پنجاب مسلم لیگ کا احیاء عمل میں آ چکا تھا۔ علامہ اقبال جو اس وقت صوبائی لیگ کے صدر تھے ان کے مشورے پر ملک برکت علی نے ۳۰ نومبر کو لاہور کی عدالت عالیہ میں فل بنچ کے سامنے شہید گنج کی اپیل دائر کی۔ فل بنچ میں چیف جسٹس مسٹر ینگ، جسٹس بھڈے اور مسٹر جسٹس دین محمد شامل تھے۔ کئی روز تک بحث جاری رہی ۱۸ دسمبر ۱۹۳۷ء کو بحث کے دوران چیف جسٹس نے کہا کہ چند نئے تنقیح طلب[۵۴] امور سامنے آئے ہیں اور ان امور کی وضاحت کے لیے قائداعظم کے مشورے سے ایک انگریز بیرسٹر ایف۔ جے کولٹ مین کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ ۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو شہید گنج کی اپیل پر عدالت عالیہ میں مزید بحث ہوئی۔ ۲۶ جنوری کو عدالت عالیہ نے اپنا فیصلہ سنایا جس کے نتیجے میں اپیل خارج ہو گئی۔ چیف جسٹس ینگ اور جسٹس بھڈے دونوں کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ جہاں تک مسجد پر قبضہ مخالفانہ کا تعلق ہے مسجد کو عام جائیداد منقولہ سے مختلف نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس لیے مسلمانوں کا شہید گنج میں نماز پڑھنے کا حق مدت ہوئی ساقط ہو چکا ہے۔ جسٹس دین محمد نے اس فیصلے سے اختلاف کیا اور مسجد پر مسلمانوں کا حق تسلیم کرتے ہوئے اپنا علیحدہ فیصلہ تحریر کیا[۵۵]۔

ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد لاہور سمیت صوبے کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں جلسے جلوس امڈ آئے۔ لاہور شہر ایک مرتبہ پھر سول نافرمانی کی زد میں تھا۔ اس مرتبہ علامہ اقبال کا یہ موقف تھا کہ اس مسئلہ کو قانونی انداز سے حل کیا جانا چاہیئے۔ چنانچہ ان کے ایماء پر ملک برکت علی نے فیصلہ کیا کہ صوبائی اسمبلی میں تحفظ مساجد کا بل پیش کیا جائے فروری ۱۹۳۸ء کے اوائل میں مسودہ تیار کر لیا گیا۔ یونینسٹ پارٹی کے بعض اراکین مسلمان ہونے کے ناطے اور بعض اپنی سیاسی ساکھ کے تحفظ کے لیے اس بل کی حمایت پر کمربستہ ہوگئے۔ غرضیکہ اس طرح یونینسٹ پارٹی کی ایک بڑی اکثریت ملک برکت علی کی ہمنوا ہو گئی۔ اس گھمبیر اور پیچیدہ صورتحال نے سر سکندر حیات (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۴۲ء) وزیراعظم پنجاب کو ایک الجھن میں مبتلا کر دیا کہ اگر بل ایوان میں پیش ہوا اور انہوں نے اس کی تائید کی تو وزارتی پارٹی کے غیر مسلم ممبران کے علیحدہ ہونے کا خطرہ تھا اور اگر انہوں نے بل کی مخالفت کی تو خود ان کی پارٹی کے مسلمان ممبران ان سے کٹ جائیں گے۔ سکندر حیات کے کامیاب دور وزارت کیلئے خطرہ پیدا کر دیا تھا[۵۶]۔ سکندر حیات نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا کہ انہوں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ بل کو اسمبلی میں پیش کرنے کی اجازت نہ دی جائے چنانچہ گورنر نے اپنے اختیارات خصوصی کو استعمال کر کے اعلان کر دیا کہ بل اسمبلی میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ گورنر کا طرز عمل دیکھ کر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر بھی سکندر حیات کے ہمنوا بن گئے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۳۸ء کو انہوں نے اسمبلی میں اپنے رویے کی حمایت میں اس انداز میں تقریر کی کہ اکیاسی مسلمان ممبروں کے استعفے ان کی جیب میں تھے۔ تمام کابینہ بشمول مسلمان وزراء میاں عبدالحیٔ اور خضر حیات ٹوانہ (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۷۵ء) انکے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ تمام ترمذہبی و سیاسی منافرت کے باوجود تمام ہندو و سکھ ممبران انکی تائید و حمایت پر تلے ہوئے تھے۔ اس سے قبل ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعے اعلان کر دیا تھا کہ شہید گنج کے قضیے پر مسلمانوں سے کسی قسم کی مصالحت یا مفاہمت نہیں ہو سکتی۔

ڈسٹرکٹ و ہائی کورٹ کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں آنے والی مجلس قانون ساز میں ملک برکت علی کے علاوہ تمام ممبران گورنر کا اشارہ پاتے ہی مسجد کے مسئلے سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ مجلس اتحاد ملت اور مجلس احرار کے

قائدین اس مسئلہ سے چشم پوشی کر چکے تھے ۔ سکھوں نے ایک قرارداد کے ذریعے مصالحت و مفاہمت کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے ۔ غرضیکہ حالات کے تمام پہلو اور وقت کے تمام تقاضے مسلمانوں کے خلاف اور سکھوں کے حق میں ظہور پذیر ہو چکے تھے ۔ اس طرح برصغیر پاک و ہند کے سب سے بڑے مسلم اکثریت کے صوبے میں مسلم عوام، اپنی تمام تر ممکنہ قربانیوں کے باوجود ایک مختصر اقلیت کے سامنے بے بس ہو کر اپنے ایک حساس ترین معاملے کو ازروئے انصاف حل نہ کروا سکے یہ بلاشبہ ایک بہت بڑی ناکامی تھی ۔ اس سانحہ میں گورنر ایمرسن برابر کا شریک تھا ۔ دراصل احرار کی تحریک کشمیر اس کے سامنے تھی ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مذہبی قیادت ایک بار پھر بازی لے جائے ۔ تحریک کشمیر سے ظاہر ہو گیا تھا کہ " ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی " اب اگر اس کو نمی ملتی رہی تو ہند میں برطانوی استعمار کا یہ بازوئے شمشیر زن بالکل ہی ہاتھ سے نہ نکل جائے کیونکہ سکھوں نے پہلے ہی گوردوارہ تحریک چلا کر گوردوارہ ایکٹ بنوا لیا تھا ۔ اس طرح سکھ سیاست پر انکی مذہبی قیادت حاوی ہو گئی تھی ۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا انہوں نے بحیثیت قوم انڈین نیشنل کانگریس کو اپنی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا تھا ۔ عرصہ ہوا جنرل اوڈائر کی دیہاتی شہری کی تقسیم کا سحر ٹوٹ چکا تھا شہروں میں انقلابی اور سیاسی خیالات سرایت کر چکے تھے ۔ نامور انقلابی یہاں سے ابھرے تھے ۔ سکھوں نے مورچہ یہاں لگایا تھا ۔ کانگریس نے یہیں دریائے راوی کے کنارے آزادی کامل کا ریزولیوشن پیش کیا تھا ۔ خاکسار تحریک یہیں سے اٹھی تھی دوسری طرف یہیں برطانوی استعماریت کے تحفظ کے لیے جانباز برٹش آرمی کی موثر قوت موجود تھی ۔ یہاں کے مسلمان عوام مذہبی و سیاسی خواص کے زیر اثر تھے ۔ جبکہ مسلمان خواص کے لیے برطانوی حکومت تو کجا ضلع کا ڈپٹی کمشنر ہی ان کا ملجا و ماویٰ تھا ۔ چنانچہ ان حالات میں انگریز حکومت کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ ہر ممکن طریقے سے مذہبی قیادت کو ناکام و غیر موثر کیا جائے تاکہ تحریک کشمیر میں مجلس احرار کو ایک مذہبی قیادت ہونے کے ناطے عوام میں جو شہرت حاصل ہوئی اور جدی پشتی وفاداران حکومت کے وقار کو جو دھچکا لگا اس کا ازالہ کیا جائے ۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت نے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہونے کے بعد ایس پرتاپ سنگھ کو عصرانہ دیا جس میں اس کی خدمات کو سراہا گیا ۔ ایک گورنر کی جانب سے کسی ڈپٹی کمشنر کیلئے اپنی طرز کا یہ پہلا اعزاز تھا [۵۰] ۔

گورنر ایمرسن نے اگر سکھوں کو اپنا ہمنوا بنا کر یا اپنی حکومت کے مفاد کے تابع ہو کر غلط فیصلے کئے تو کوئی نئی بات نہیں برطانوی امپریل ازم کا دامن ایسی روایات سے بھرا ہوا ہے ۔ لیکن اس پورے معاملے کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ اکابرین جنہوں نے یہ ذمہ داری لی تھی یا وقت نے جن پر یہ ذمہ داری ڈال دی تھی وہ بھی شہید گنج کے ملبے پر اپنے سیاسی قد کاٹھ کو اونچا کرنے میں مصروف رہے

مسجد شہید گنج کا تنازعہ مجلس احرار [۵۸] کے قائدین کے لیے ایک اہم سیاسی امتحان تھا ایک مذہبی جماعت ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو مجلس احرار سے بڑی توقعات تھیں اگرچہ ابتدا میں اس جماعت نے بڑی گرم جوشی سے اس تحریک میں شمولیت کی لیکن بالآخر اس تنازعے کو 'انجمن تحفظ مسجد' کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے یہ کہہ کر ایک جانب ہو گئی کہ احرار کو مٹانے ۔ یونینسٹ وزارت بنانے اور صوبے کو بکمال و تمام اپنے ہاتھ میں رکھنے کی دھن نے شہید گنج کا قضیہ پیدا کیا ۔ چال یہ تھی کہ احرار حصہ لیں تو پٹ جائیں گے گریز کریں گے تو مٹ جائیں گے ۔ پہلی صورت میں سرکار کے معتوب ہو کر جیل خانے میں جگہ ہو گی ۔ دوسری صورت میں مسلمانوں کے غیظ و غضب کا شکار ہو کر اپنی عزت و شہرت دونوں گنوا بیٹھیں گے ۔ وہی ہوا احرار چکی کے اس پاٹ میں پس کر رہ گئے ۔ ان پر اتنی طاقتوں نے حملہ کیا کہ ان کے لیے سنبھالا مشکل ہو گیا ۔ جن لوگوں نے اس کا (مسجد کے انہدام کو رکوانے کا) بیڑا اٹھایا تھا ان میں سے اکثر صرف احرار کو پٹوانے کے لیے شامل ہوئے تھے ۔ بعض گورنر کے ایجنٹ تھے ۔ کچھ سی آئی ڈی کے گماشتے تھے اور کئی ضلعی حکام یعنی ایس پرتاپ سنگھ (ڈپٹی کمشنر) اور نریندر سنگھ (سٹی مجسٹریٹ) کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس نظریے کے حق میں یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ مجلس مشاورت میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ انہدام کو روکنے کے لیے حکم امتناعی (Stay Order) لیا جائے ۔ مولانا اختر علی نے ذمہ داری لی لیکن سردار نریندر سنگھ کے جھانسے میں آگئے راتوں رات مسجد کا صفایا ہو گیا ۔ صبح حکم امتناعی کا تصور خارج از بحث تھا [۵۹] ۔ احرار کے زعماء و اکابرین اپنے حق میں ایک دلیل بھی ایسی نہیں لا سکے جو ان کے مسئلہ پر پہلو تہی کا جواز بن سکے ۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حصہ لینے والے مخلص تھے یا نہیں ۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ کیا مسلمان اس مطالبے میں حق بجانب نہیں تھے ؟ اگر حق بجانب نہیں تھے تو احراری آگے بڑھ کر

جرأت کے ساتھ مسلمانوں کو سمجھاتے اور اگر واقعی یہ صحیح مسئلہ تھا تو کیا اس معاملے میں مسلمانوں کی ترجمانی کا فریضہ ان پر عائد نہیں ہوتا تھا؟ ان کا شریک ہونا تو اس وقت اور ناگزیر ہو گیا تھا جب انہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کا ایک جائز مطالبہ جو ان کے عقائد سے متعلق ہے برطانوی ایجنٹوں کے ذریعے ملیا میٹ ہو سکتا ہے۔ کجا یہ کہ قائدین مخلص نہیں ہیں اس لیے ہم خاموش ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر احراری حصہ لیں گے تو مٹ جائیں گے یہ نظریہ بھی "عذر گناہ بدتر از گناہ" کے مصداق مضحکہ خیز ہے۔ اور اگر یہی نظریہ تھا تو پھر احرار جماعت قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر مٹنے کا خوف تھا تو پھر سیاست میں آبلہ پائی کرنے اور اس خار دار وادی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا تھا؟ پھر تحریک کشمیر کیوں شروع کی گئی تھی؟ کانگریس کی سول نافرمانی (۱۹۳۰ء) میں حصہ دار کیوں بنے تھے؟ برطانوی استعماریت کے خلاف احراری علماء کرام رات رات بھر کیوں تقاریر کرتے تھے اور کن مقاصد کے لیے احراری کارکن دار و رسن کو اپناتے تھے؟ آخری بات یہ کہ کیا مولانا اختر علی خان کی ہی ذمہ داری تھی کہ وہ حکم امتناعی حاصل کریں جب وہ پہلے ہی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ یہ تمام حضرات مخلص نہیں ہیں تو وہ کم از کم اس قانونی مسئلہ پر تو آگے بڑھ سکتے تھے

تاریخی اوراق اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ جب شہید گنج کے مسئلہ پر پورا لاہور جل رہا تھا اور سارا صوبہ احتجاج کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ اس وقت احراری خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور جب تمام عدالتیں اس کے بارے میں فیصلہ دیکر سکھوں کو حق بجانب قرار دے چکی تھیں، غریب ماؤں کے بیٹے سینوں پر گولیاں کھا کر دم توڑ چکے تھے۔ اس وقت احراریوں نے چپ سادھی ہوئی تھی اور اب جب کہ صورتحال بالکل ہی ناموافق ہو گئی تو مجلس احرار نے سول نافرمانی شروع کر دی [۶۰]۔

مجلس احرار کا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے اس مسئلہ پر توجہ نہیں دی انکے مخالفین زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو خانہ خدا سے زیادہ اپنی جانیں عزیز تھیں اور ان کے حمایتی یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ ان سے فیصلے کی غلطی ہوئی ہے لیکن مجلس اتحاد ملت کا معاملہ اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ ابتداء میں پیر جماعت علی شاہ علی پوری اس کے امیر بنائے گئے " زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن " والی بات ہوئی۔ مولانا محمد اسحاق مانسہروی، میر مقبول اور بڈھے شاہ وغیرہ اس

کے اکابرین میں سے تھے ۔ یہ تمام حضرات حکومت کے حاشیہ بردار تھے ۔ میر مقبول سکندر حیات کے سمدھی تھے اور گورنر سے قریبی تعلقات کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے تھے ۔ بڈھے شاہ کا کام سی آئی ڈی کے لیے مخبری کرنا تھا۔ بات یہیں تک محدود نہ تھی مولانا ظفر علی خان رہا ہو کر آئے تو انہوں نے اتحاد ملت کی مجلس عاملہ میں اپنے بھائی چودھری غلام حیدر، اپنے بیٹے اختر علی خان، ڈاکٹر محمد عالم اور مرزا معراج الدین، ایس پی (سی آئی ڈی) کے قریبی دوست میاں فیروز الدین جیسے لوگوں کو نامزد کر دیا ۔ مولانا اختر علی خان نے عین اس موقعہ پر جبکہ مظاہرین کی ثابت قدمی کی بنا پر گورنر خود چل کر کوتوالی آیا تھا، شہید گنج کا مورچہ ختم کروادیا۔ جس مظاہرے کو گورا فوج کی پلٹنیں ختم نہ کر سکیں اسکو بغیر کسی ضمانت کے تہس نہس کرادیا۔ اختر علی خان نے ہی حکم امتناعی کی ذمہ داری قبول کی تھی ۔ لیکن ایک مجسٹریٹ اور وہ بھی سکھ کی باتوں میں آکر مجرمانہ غفلت کی اور مسجد کو مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کروادیا۔ بات یہاں تک محدود نہیں رہی ۔ میاں فیروز الدین نے مسجد شہید گنج کانفرنس منعقدہ لاہور پر ٹیکس لگا کر ہزاروں روپے کھرے کر لئے ۔ مولانا ظفر علی خان دس ہزار روپے رنگون سے لائے وہ انہوں نے ملک لال خان جنرل سیکرٹری کو دیئے ۔ وہ انہوں نے ماضی کے قرضے میں وضع کر لئے ۔ [61] ۔ شہید گنج کانفرنس میں جو قراردادیں پیش ہوئیں اس کی حکومت سے پہلے منظوری لی گئی ۔ ڈاکٹر عالم مجلس اتحاد میں شہید گنج کے نام پر کامیاب ہوئے اور کانگریس کے صوبے میں ڈپٹی لیڈر مقرر ہو گئے ۔ اگرچہ مولانا ظفر علی خان نے بلاواسطہ کوئی مفاد نہیں اٹھایا تھا اور وہ شہید گنج کے تنازعے میں مخلص تھے لیکن حقیقی کردار ادا نہ کر سکے ۔ مجلس اتحاد کی تمام مجلس عاملہ [62] انکی نامزد کردہ تھی لیکن سوائے شورش کاشمیری اور یعسوب الحسن کے کسی نے بھی آگے بڑھ کر وہ کردار ادا نہ کیا جو لاہور کا ایک عام مسلمان شہری ادا کر رہا تھا۔ مسجد شہید گنج سے وابستگی کا عالم تو یہ تھا کہ سید حبیب کی جگہ جب مولانا ظفر علی خان نے ملک لال خان کو اتحاد ملت کا سیکرٹری بنایا تو سید حبیب کا قلم ظفر علی خان کے خلاف لکھنے میں مصروف ہو گیا دوسری طرف ملک لال خان نے مولانا ظفر علی خان پر مجلس اتحاد ملت کی جمع شدہ رقم کی وصولی کا دعویٰ دائر کر دیا ۔ آخر فریقین کی رضامندی سے مقدمہ ختم ہوا۔ یہ تھا وہ اخلاص نیت اور اشتراک عمل جس کی بنیاد پر وہ بیک وقت انگریز حکمرانوں اور سکھ جنونیوں سے لڑنے چلے تھے ۔ مولانا اختر علی خان کا معاملہ تو اس سے بھی

زیادہ سنگین تھا۔ انہوں نے عملی طور پر نہ صرف فیصلہ کن معرکوں میں مظاہرین کو پسپا ہونے پر مجبور کیا بلکہ مسجد کی وقف کی دستاویز ملک لال خان سے وصول کی اور پھر اس کو گم کر دیا [۶۳]۔ علاوہ ازیں ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام اخبارات و سیاسی قائدین حکومت کے مسلم کش رویہ کی مذمت کرتے لیکن ایسا نہ ہوا۔ خود تحریک کے سرخیل مولانا ظفر علی خان کا اخبار "زمیندار" لکھتا ہے:

> یوں تو ہر حال میں اپنے اس فعل (مسجد کو منہدم کرنا) کا ذمہ دار خود سکھ ہے۔ لیکن ازبسکہ اس نے اپنے اس غیر ذمہ دار اور امن سوز فعل کا ارتکاب فوج اور پولیس کی موجودگی میں کیا۔ حکومت کے طریق عمل کو بھی بعض مسلمان اشتباہ سے دیکھنے لگے۔ مگر حکومت نے سکھوں کے طرز عمل سے بیزاری اور اس کے فعل سے کامل لاتعلقی کا اظہار کر کے اپنی پوزیشن واضح کر دی۔ عقل و دیانت کا تقاضہ ہے کہ حکومت کے اس اعلان کے بعد اس کے طریقۂ عمل کے متعلق کوئی مسلمان بدگمانی کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ [۶۴]

اس قسم کے بیانات سے حکومت پر یہ امر واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات اس قدر ہیں کہ حکومت اس مسئلے پر من مانی کاروائی کر سکتی ہے۔

جہاں تک پنجاب کی سب سے بڑی سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی کا تعلق ہے وہ مسلم اکثریتی جماعت ہونے کے باوجود شہید گنج کے تنازعے میں خاموش تماشائی بنی رہی۔ اگرچہ یونینسٹ پارٹی کے چند ارکان نے ۲۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو اپنے ایک اجلاس میں یہ تجویز دی تھی کہ فضل حسین (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۶ء) سے درخواست کی جائے کہ وہ فوری طور پر لاہور تشریف لائیں اور مسجد شہید گنج کے تنازعے کے سلسلے میں رہنمائی کریں [۶۵]۔ لیکن فضل حسین بنیادی طور پر اس تحریک کے طریق کار کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک اس مسئلے کا ممکنہ حل یہ تھا کہ باہمی افہام و تفہیم کے تحت سکھوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ مسجد کی جگہ اور عمارت تعمیر نہ کریں۔ چودھری شہاب الدین نے آپ کی ہدایت کے مطابق تحریک سول نافرمانی کے خاتمے کی اپیل کی۔ فیروز خان نون نے سکھوں اور مسلمانوں دونوں فریقین کو موردالزام ٹھہرایا کہ انہوں نے حکومت کی بات نہیں مانی۔ فیروز خان نون نے فضل حسین کو یہ تحریر کیا کہ " وہ مجبور تھا کیونکہ گورنر سکھوں سے مرعوب تھا لہذا مسلمانوں کی تکالیف یا مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا" [۶۶]۔ جب حکومت نے اصل مسئلے سے

مسلمانوں کی توجہ ہٹانے کے لیے قبرستان سے متعلق بل اور وقف بل پاس کئے تو فضل حسین کا نقطہ نظریہ تھا کہ یہ دونوں بل مسلمانوں میں مزید بے چینی کا سبب بنیں گے [۶۷] اور یہ کہ اگرچہ وقتی طور پر مسلمانوں کی توجہ بٹ جائے گی لیکن حکومت کی جانب سے سکھوں اور ہندوؤں کی غیر ضروری طرفداری آگے چل کر مسلمانوں میں مزید بے چینی کا سبب بنے گی لیکن دوسری جانب فضل حسین نے مسلمانوں کے جذباتی طرز عمل کو ناپسند کیا۔ اگرچہ مسلمان ہونے کے ناطے ان کی یہ خواہش تھی کہ اس قضیے کا تصفیہ مسلمانوں کے حق میں ہو لیکن وہ مسلمانوں کے انتہا پسندانہ یا غیر آئینی طرز عمل کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں اس سے مسلمانوں کے موقف کو نقصان پہنچ رہا تھا ان کے نزدیک یہ تنازعہ مذہبی کی بجائے سیاسی رنگ اختیار کر چکا تھا لہذا اس تحریک کے حامیوں کو یہ تاکید کرتے رہے کہ وہ صبر کے ساتھ قانونی چارہ جوئی کریں۔ ان کے خیال میں تشدد پر مبنی طرز عمل کے تحت مجلس اتحاد ملت، مجلس احرار اور خاکسار تحریک وقتی شہرت تو حاصل کر سکتی ہیں لیکن اس سے مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی جماعت نے کبھی بھی ایسے طریق کار کی حوصلہ افزائی نہ کی جس سے حکومت کی نظروں میں وقار ختم ہو جائے یا عدم اعتماد کی فضا پیدا ہو، لہذا جب چند انتہائی قابل اعتماد یونینسٹوں نے شہید گنج تحریک کی مدد کی تو فضل حسین کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے آپ نے یہ تجویز پیش کی کہ اس ضمن میں ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے اوقاف سے متعلق جائزہ لے کر حکومت کو رپورٹ پیش کرے اور تمام فرقوں اور مذاہب کی عبادت گاہوں کو قانون کے ذریعے مکمل تحفظ فراہم کیا جائے۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یونینسٹ پارٹی نے اخلاقی یا سیاسی اعتبار سے مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لیے کوئی مدد فراہم نہ کی۔ دراصل یہ پارٹی بڑے بڑے جاگیر داروں اور سجادہ نشینوں پر مشتمل تھی جنہیں حکومت کی وفاداری کے عوض بے شمار مراعات حاصل تھیں لہذا عوامی پلیٹ فارم سے یا اسمبلی میں یہ طبقہ کسی ایسی تحریک کی تائید کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو حکومت کی خواہش کے برعکس ہو۔

جہاں تک آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے زعماء کا تعلق ہے انہوں نے مرکزی اور صوبائی سطح پر اس مسئلے کے حل کی حتی الوسع کوشش کی۔ قضیے کی ابتداء کے وقت صوبہ میں لیگ کا وجود

تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا۔چنانچہ مظاہروں کو منظم کرنے، گرفتاریاں پیش کرنے اور سول نافرمانی و جلسوں میں شرکت سے متعلق لیگ کے کردار کا کوئی سوال ہی نہیں۔لیکن اس کے باوجود جب مرکزی لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح کو اس مسئلے میں اپنا کردار ادا کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے لاہور پہنچ کر اس مسئلے کے حل کے لیے بھرپور کوشش کی۔بعد ازاں اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں شہید گنج مسجد کی بازیابی کے لیے ایک جامع قرارداد [۶۸] پاس کی۔مزید برآں قائداعظم نے کہا کہ اگر مستقبل قریب میں شہید گنج کا کوئی مناسب فیصلہ نہ ہوا تو اس قضیے کے حل کے لیے مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا جائے گا [۶۹]۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تاکہ مسجد شہید گنج کے مسئلے پر غور کیا جائے۔لیگ کی کونسل نے اس بات کا اعلان کیا کہ مسجد شہید گنج کی بازیابی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ بن چکا ہے۔یہ بھی اعلان کیا گیا کہ یکم فروری ۱۹۳۸ء کو برصغیر میں یوم شہید گنج منایا جائے اور مسلمان جگہ جگہ جلسے کرکے مسلم لیگ کی اس قرارداد کی تائید کریں [۷۰] لہذا یکم فروری کو مسلم لیگ کے اعلان کے مطابق جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے اور قراردادیں منظور کی گئیں۔اس موقع پر مسلم لیگ کی قیادت کا یہ اعجاز تھا کہ اتحاد ملت اور مجلس احرار نے یکجا ہو کر مسلم لیگ کے زیر اہتمام جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کی [۷۱]۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ صوبائی مسلم لیگ نے بھی ۱۹۳۶ء میں تنظیم نو کے بعد شہید گنج کے تنازعے میں کافی موثر کردار ادا کیا۔جب ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء کو مسٹر سیل نے مسلمانوں کا دعویٰ خارج کر دیا تو علامہ محمد اقبال صدر صوبائی لیگ کے مشورے سے ہی ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی تھی۔جب ہائی کورٹ نے مزید وضاحتیں طلب کیں تو صوبائی لیگ کے نائب صدر ملک برکت علی نے مرکزی لیگ کے صدر کے مشورے سے مسٹر کولٹ مین کو مقدمہ کے لیے تیار کیا تھا جب مقدمے کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوا تو علامہ محمد اقبال نے اس مسئلہ کا دستوری حل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ان کا خیال تھا کہ یہ قانون جس کی رو سے خانہ خدا کی تقدیس مجروح ہوتی ہے اور مسجد بھی قبضہ مخالفانہ میں جا کر بارہ سال بعد اپنی حرمت کھو بیٹھتی ہے بالکل غلط ہے، اس قانون کو ختم ہونا چاہیئے۔انہوں نے ملک برکت علی سے کہا کہ وہ پنجاب اسمبلی میں ایک مسودہ

قانون پیش کریں تاکہ مسجد کی حفاظت کا معقول بندوبست ہوسکے ۔چنانچہ تحفظ مساجد کا بل لیگ کے صدر اور نائب صدر کی کوشش کا نتیجہ تھا ۔جس کو وزیر اعظم پنجاب کے اشارے پر گورنر نے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے پیش ہونے سے روک دیا تھا ۔نیز وزیراعظم نے اپنے اس فعل پر جب توضیحی بیان جاری کیا تو صوبائی مسلم لیگ کے نائب صدر نے اس کی قلعی کھول کر عوام وخواص پر یہ واضح کر دیا کہ مسجد کا تقدس اور حصول ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے [۷۲]

آل انڈیا مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا یہ مختصر سا جائزہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی مرکزی جماعتوں میں مسلم لیگ ہی وہ واحد سیاسی تنظیم تھی جس نے اس مسئلے میں خلوص نیت سے دلچسپی لیتے ہوئے کسی حد تک مسلمانان پنجاب کی ترجمانی کی اور ضبط و تحمل کی راہ دکھائی ۔یوں تو انڈین نیشنل کانگریس بھی تھی جو کہ تمام اہل ہند کی نمائندگی کی دعویدار تھی اور حق وانصاف پر مبنی پالیسیوں کو اپنا نصب العین گردانتی تھی ۔جمعیت علماء ہند بھی موجود تھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے علماء کی جمعیت ۔ بھلا ان سے بڑھ کر کون اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت سمجھ سکتا تھا لیکن ان جماعتوں نے لبوں کو جنبش تک نہ دی ، کوئی قرارداد تک منظور نہ کی ۔ کانگریس کل ہند کی نمائندگی کی دعوے دار تھی ، اس میں مولانا ابو الکلام (۱۸۸۸ء ۔ ۱۹۵۸ء) جیسی یگانہ روزگار ہستی موجود تھی اگر وہ چاہتے تو مسلمانوں اور سکھوں کو کسی قابل عمل حل تک لانے کی سعی تو کرسکتے تھے لیکن ان جماعتوں نے اس مسئلے کے بارے میں نہ کوئی تحریک پیش کی اور نہ ہی مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا سوائے اس کے کہ جب سکندر حیات نے یہ اعلان کیا کہ مسجد شہید گنج تحریک سول نافرمانی سے نہیں مل سکتی تو کانگریس کی ہائی کمان نے ان کو مبارک باد کا تار ارسال کیا ۔آخر میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر مسلم اکابرین ، وزارتی عہدوں پر متمکن حضرات یا حکومت کے ایوانوں تک رسائی رکھنے والی شخصیات ابتداء ہی سے اس مسئلے پر توجہ دیتیں تو کعبہ کی بیٹی کا تقدس پامال نہ ہوتا اور نہ ہی بے گناہ غریب و معصوم نوجوان گولیوں کا نشانہ بنتے ۔اور اس طرح پنجاب تحریک کشمیر کے بعد تحریک شہید گنج سے بھی کامیاب وکامران ہو کر گزرتا ۔

حوالہ جات

۱۔

Amalendu De, *The Shahidganj Agitation and the Khaksars : The Punjab Past and Present*, Vol. ix - II, Oct, 1975, p. 360.

مزید دیکھیے۔ گنڈا سنگھ

History of the Gurdwara Lahore from its Origin to November 1935, Lahore, 1st. edition, December, 1935, pp. 1-20.

۲۔ ولی اللہ خان

Sikh Shrines in West Pakistan, Lahore, 1962, p. 52.

مزید دیکھیے ۔ روزنامہ انقلاب، لاہور، ۱۱ جولائی ۱۹۳۵ء۔ عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۵۶۷۔ سید نور احمد، مارشل لاء سے مارشل لاء تک، لاہور، سن ندارد، ص ۱۶۶۔

۳۔ مفتی غلام سرور، تاریخ مخزن، لاہور، ۱۸۷۷ء، ص ۲۱۳۔

۴۔ گیانی خزان سنگھ، تاریخ گوردوارہ شہید گنج، لاہور، ۱۹۳۸ء، ص ۳۸۔

مزید دیکھیے بٹالوی، بحوالہ سابقہ ص ۵۶۸

۵۔ ایس ۔ ایم ۔ لطیف

History of Punjab, Lahore, 1891, p. 213.

مشہور سکھ مورخ گیانی خزان سنگھ نے اسکی مثالیں بھی دی ہیں۔ جیسا کہ گوردوارہ شہید گنج بیرون دروازہ مستی۔ گوردوارہ شہید گنج نولکھا۔ گوردوارہ شہید گنج مال روڈ وغیرہ ۔ گیانی خزان سنگھ، بحوالہ سابقہ، ص ۲۱۳۔

۶۔ نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، لاہور، ۱۸۶۴ء۔ بحوالہ بٹالوی، بحوالہ سابقہ، ص ۵۶۸۔ ۵۶۹۔

۷۔ ۱۷۲۲ء میں اس مسجد کا ایک وقف نامہ تیار کیا گیا تھا۔ جس کی رو سے مسجد کو وقف بنا کر اس کا قبضہ نسل در نسل ایک شخص مسمی شیخ دین محمد کو دے دیا گیا تھا۔ یہ وقف نامہ فلک بیگ ولد مرزا قربان خان کی طرف سے ۹ ذوالحجہ ۱۱۳۴ھ کو تحریر کیا گیا تھا جس میں دین محمد کو وقف کا استاد ظاہر کیا گیا تھا۔ فیصلہ مقدمہ قضیہ شہید گنج، ڈسٹرکٹ جج لاہور، (مترجم) شریف خان، نگینہ پریس بک ڈپو، بیرون بھاٹی گیٹ، لاہور۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ عظیم حسین

Fazl-i-Husain : A Political Biography, Bombay, 1946, p. 286.

۱۰۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرف سے اپیل انجمن کے سیکرٹری سید محسن علی شاہ نے دائر کی تھی انہوں نے اپنے دعویٰ میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ مسجد کی عمارت نہ تو گوردوارے کی ملکیت ہے اور نہ ہی سکھ قابضین کی ذاتی جائیداد ہے۔ یہ مسجد ہے لہذا اسے انجمن کے حوالے کیا جائے۔ سید نور احمد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۷۔

۱۱۔ گنڈا سنگھ، بحوالہ سابقہ، ص ۵۸۔

۱۲۔ سید نور احمد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۷

۱۳۔ گنڈا سنگھ، بحوالہ سابقہ، ص ۶۶۔

۱۴۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، ۲ فروری ۱۹۳۵ء۔

۱۵۔ ایضاً، ۳ جولائی ۱۹۳۵ء۔

۱۶۔ عبدالمجید سالک، سرگزشت، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۳۲۰۔

۱۷۔ وفد درج ذیل آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ ۱۔ سید محسن شاہ ایڈووکیٹ۔ ۲۔ خان صاحب میاں امیرالدین میونسپل کمشنر۔ ۳۔ ملک محمد اسلم بیرسٹر۔ ۴۔ خواجہ غلام مصطفےٰ۔ ۵۔ مولانا اختر علی خان۔
۶۔ میاں فیروز الدین احمد میونسپل کمشنر۔ ۷۔ آغا ایاز عباس۔ ۸۔ محمد دین۔ انقلاب، ۴ جولائی ۱۹۳۵ء۔

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ حکومت کے پریس نوٹ کے مکمل متن کے لیے دیکھیے۔ ایضاً۔

۲۰۔ ایضاً۔ ۵ جولائی ۱۹۳۵ء۔

۲۱۔ سردار مہتاب سنگھ صدر گوردوارہ کمیٹی ننکانہ صاحب نے یہ اعلان کیا کہ اگر مسجد سے متعلق مورچہ بندی بھی کرنا پڑی تو وہ کمیٹی سے اپیل کر کے ایک لاکھ روپے، ایک ہزار سوار اور ایک ہزار آٹے کی بوری جمع کرے گا ایضاً۔

اسی طرح مسلمانوں کے رہنما مولانا ظفر علی خان۔ سید حبیب اور ملک لال خان مسلمانوں کو مسجد کے سامنے سے منتشر کرتے اور جب مسلمان واپس ہونے لگتے تو سکھ شہید گنج کی بالکونی سے نعرہ لگاتے "راج کرے گا خالصہ" جو مزید اشتعال کا سبب بنتا۔ شورش کاشمیری، بوئے گل نالہ دل۔ دود چراغ محفل، جلد اول، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۴۷۔

۲۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ ایضاً۔

۲۳۔ انقلاب، بحوالہ سابقہ، ۴ جولائی ۱۹۳۵ء۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ ایضاً، ۷ جولائی ۱۹۳۵ء۔

۲۶۔ سید نور احمد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۸۔

۲۷۔ شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ص ۷۷

۲۸۔ بٹالوی، بحوالہ سابقہ، ص ۵۶۹۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۷۵۔ مزید دیکھیے سید نور احمد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۸۔

۳۰۔ بٹالوی، بحوالہ سابقہ، ص ۵۶۹۔

۳۱۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، ۹ جولائی ۱۹۳۵ء۔

۳۲۔ انقلاب، بحوالہ سابقہ، ۱۳ جولائی ۱۹۳۵ء۔ مزید دیکھیے سید نور احمد، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۹۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۷۰۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۹۱۔

۳۵۔ انڈین انیول رجسٹر، حصہ دوئم، ۱۹۳۵ء، ص ۱۹۷۔

۳۶۔ شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ص ۹۲۔

۳۷۔ وحید احمد (ed.)

Diary and Notes of Mian Fazl-i-Husain, Lahore, 1977, July 23, 1935, p. 154.

۳۸۔ پیر جماعت علی شاہ علی پوری ایک انتہائی بااثر شخصیت تھے جنہیں پنجاب کے دیہی علاقوں اور حکومتی حلقوں میں مؤثر حیثیت حاصل تھی۔ آپ کے مرید نہ صرف بڑی تعداد میں تھے بلکہ بااثر بھی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کی فتح یابی کے بعد گورنر پنجاب مائیکل اوڈائر (۱۸۶۴ء۔ ۱۹۴۰ء) کو جو سپاسنامہ پیش کیا گیا اس میں پیر صاحب کے دستخط بھی تھے۔ ان کے تعویذ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں میں تقسیم ہوئے تھے کہ ان تعویذوں کی برکت سے ان پر ترک گولی اثر نہیں کرے گی۔ اس کے باوجود عوام میں اس قدر مقبول تھے کہ جب پیر صاحب حصول مسجد شہید گنج کی تحریک کے لیے امیر ملت منتخب ہو کر لاہور پہنچے تو انکا فقید المثال استقبال کیا گیا اور جلوس نکالا گیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ لاہور میں اتنا بڑا جلوس اس سے پہلے شاذ ہی دیکھا ہو۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔ ۱۰۲

۳۹۔ محمد خورشید

The Role of the Unionist Party in the Punjab Politics : 1923-1936, unpublished Ph.D. Dissertation, Islamia University, Bahawalpur, January 15, 1992, pp. 251-252.

۴۰۔احسان ،لاہور ، ۸ ستمبر ۱۹۳۵ء۔

۴۱۔ یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو راولپنڈی کانفرنس کے دوران مسجد شہید گنج کے قضیے میں مجلس احرار کے عدم دلچسپی کے سبب " مجلس اتحاد ملت " کے نام سے جماعت تشکیل دی گئی اس جماعت میں انتہائی مذہبی جذبات کے حامل افراد مثلاً ابو سعید انور ، عبدالکریم شورش ،یعسوب الحسن اور مولا بخش جیسے لوگ شامل تھے ۔ جبکہ پیر جماعت علی شاہ اس جماعت کے امیر مقرر کئے گئے ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خان ، سید حبیب اور فیروز الدین احمد اس کے اہم ترین رکن تھے ۔ جب پیر جماعت علی شاہ نے پارٹی کے معاملات اور تحریک مسجد شہید گنج میں دلچسپی لینے کی بجائے جنوبی ہندوستان کے دورے پر جانے کا فیصلہ کیا تو مئی ۱۹۳۶ء میں مولانا ظفر علی حان اس جماعت کے سربراہ اعلیٰ مقرر ہوئے ۔ محمد خورشید ،بحوالہ سابقہ ،ص ۲۶۹۔

۴۲۔ایضاً۔

۴۳۔ گنڈا سنگھ ،ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے ۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ ، ۱۰ نومبر ۱۹۳۵ء۔

۴۴۔ محمد خورشید ،بحوالہ سابقہ ،ص ۲۶۹۔

۴۵۔ایضاً ،ص ۲۵۳۔ ۲۵۴۔

۴۶۔ انقلاب ،بحوالہ سابقہ ، ۱۵ ستمبر ۱۹۳۵ء۔

۴۷۔ بڈھے شاہ کے بارے میں مکمل آگہی کے لیے دیکھیے ۔ شورش کاشمیری ، پس دیوار زنداں ، لاہور ، سن ندارد ۔

۴۸۔

David Paul Gilmartin, *Tribe, Land and Religion in the Punjab : Muslim Politics and the Making of Pakistan*, unpublished Ph.D. Dissertation, University of California, Berkeley, 1979, p. 191

۴۹۔ شورش کاشمیری ،بحوالہ سابقہ ،ص ۱۱۷، ۱۱۸

۵۰۔ بٹالوی ،بحوالہ سابقہ ،ص ۵۷۲۔ ۵۷۳۔

۵۱۔ایضاً ،ص ۵۷۶۔

۵۲۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے اپنے شمارے مورخہ ۳ مارچ ۱۹۳۶ء میں لکھا کہ پنجاب کے مقامی لیڈروں کی ناکامی اور مسٹر جناح کی کامیابی کا سب سے بڑا رازیہ ہے کہ جناح کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان پر سرکار پرستی کا

طعنہ نہیں دے سکتا انہیں، ہمیشہ بائیں بازو کا لیڈر سمجھا جاتا ہے اور ان کے بائیں بازو کے رجحانات کے سبب ہی بیک وقت سکھوں اور مسلمانوں نے ان کی بات کو سننا اور جاننا قبول کیا۔

۵۳۔ فیصلہ ایس۔ ایل۔ سیل، آئی سی ایس۔ ڈسٹرکٹ جج، لاہور، مقدمہ قضیہ مسجد شہید گنج، لاہور (مترجم) شریف خان ملک، نگینہ پریس بک ڈپو، لاہور۔

۵۴۔ تنقیح طلب امور درج ذیل تھے:

۱۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس دعویٰ پر قانون میعاد کا اطلاق ہوتا ہے تو کیا اس تاریخ سے جب مسجد شہید گنج مسمار کی گئی تھی نئی میعاد کا آغاز ہونا چاہیئے تھا؟ ۔۲۔ اگر محولہ بالا شق تسلیم کی جائے تو کیا مسجد یا مسجد میں نماز پڑھنے والوں کو یہ حق ہے کہ وہ مدعا علیہم کے نام عدالت سے اس نوع کے حکم امتناعی کے اجراء کی درخواست کریں کہ مدعا علیہم مسجد کو دوبارہ تعمیر کریں۔ ۳۔ اگر ایسا حق موجود ہے تو کیا عدالت اس نوع کا حکم امتناعی جاری کرنے کی مجاز ہے۔ کیا عدالت اس نوع کا حکم امتناعی جاری کرے گی اور کیا اس حکم امتناعی پر عملدرآمد ہو سکتا ہے؟۔ بٹالوی، بحوالہ سابقہ، ص ۵۷۹ - ۵۸۰

۵۵۔ ایضاً، ص ۵۸۳۔

۵۶۔ کوپ لینڈ

Report on the constitutional Problems in India, vol. iii. London, n.d. pp. 48-49.

۵۷۔ شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ص ۱۰۹۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے جانباز مرزا، کاروان احرار، جلد دوم، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۵۸۔ مجلس احرار ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو معرض وجود میں آئی۔ یہ جماعت شہری علاقوں میں رہنے والے مذہبی رجحانات کے حامل درمیانے اور نچلے درجے کے مسلمانوں کی ترجمان تھی جبکہ دیہی علاقہ میں اس جماعت سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ اس جماعت کے دیگر کلیدی قائدین مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری (۱۸۹۱ء - ۱۹۶۱ء) مولانا حبیب الرحمان، مولانا ظفر علی خان، غازی عبدالرحمان، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر (۱۸۹۵ء - ۱۹۷۴ء) اور مولانا عبدالقادر قصوری تھے۔ یہ جماعت سوویت انقلاب سے بہت متاثر تھی لہذا اس کے نوجوان ارکان سرخ لباس پہنتے اور بینڈ کے ساتھ روزانہ پریڈ کرتے تھے، اور کلہاڑی ساتھ رکھتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا تنازعہ اس جماعت کے لیے ایک بڑا سیاسی امتحان تھا۔ اگرچہ ابتداء میں مجلس احرار نے بڑی سرعت سے اس تحریک میں حصہ لیا لیکن بعد میں انتخابات میں شمولیت کی غرض سے سرد مہری اختیار کرلی کیونکہ مجلس احرار کے قائدین اس موقع پر تحریک میں حصہ لے کر جیل نہیں جانا چاہتے تھے۔ احرار موومنٹ ان دی پنجاب،

۱۹۳۱ء - ۱۹۳۸ء - خفیہ رپورٹ، سی احمد انسپکٹر جنرل آف پولیس (سی آئی ڈی پنجاب)، ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص ۴۵-
۴۶

مزید دیکھیے

اکرام علی ملک (ed.)

A Book of Readings on the History of Punjab, Lahore, 1970, p. 559.

۵۹ - شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ص ۷۷ - مزید تفصیلات کے لیے مظہر علی اظہر، ایک خوفناک سازش، امرتسر، ۱۹۳۶ء -

۶۰ - شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ص ۱۶۴ -

مجلس احرار کے مخالفین احراریوں کے خلاف ان خطوط کا حوالہ بھی دیتے ہیں جو روزنامہ انقلاب نے شائع کیے تھے اور جن میں انہوں نے اس تحریک کے بارے میں اپنا نقطہ نگاہ واضح کیا تھا - لیکن احراریوں نے ان خطوط کی صحت سے انکار کر دیا تھا - اگرچہ یہ انکار بھی سطحی تھا - انہوں نے خط شائع کرنے والوں پر ہتک عزت کا دعویٰ کرنے کا اعلان بھی کیا - لیکن عملی طور پر خاموش رہے - جبکہ دوسری طرف خطوط شائع کرنے والے کا طرز عمل بھی اتنا صاف و شفاف نہیں تھا - خطوط عین انتخابات کے وقت شائع ہوئے نیز خطوط شائع کرنے والے نے مزید خطوط شائع کرنے کا اعلان بھی کیا لیکن وہ بھی صرف اعلان تک محدود رہا چنانچہ درج بالا حقائق کی روشنی میں ان خطوط کی بنیاد پر احراریوں کے خلاف کوئی الزام لگانا مناسب دکھائی نہیں دیتا -

۶۱ - شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ص ۱۲۹ - ۱۳۰ -

۶۲ - مجلس عاملہ کے ارکان کے نام درج ذیل تھے: سید حبیب، فیروز الدین احمد، ابو سعید انور، عبدالکریم شورش ملک لال خان، مولانا اختر علی خان، یعسوب الحسن، چودھری غلام حیدر خان، مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر محمد عالم -

۶۳ - شورش کاشمیری، بحوالہ سابقہ، ص ۱۹۴ -

۶۴ - روزنامہ زمیندار، لاہور، ۷ ستمبر ۱۹۳۵ء -

۶۵ - اس دوران فضل حسین اپنی بیماری کے سبب آرام کے لیے ایبٹ آباد میں مقیم تھے - اور صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ لاہور جا کر اس تنازعے کے بارے میں رہنمائی کرتے یا مثبت تجاویز پیش کرتے - عظیم حسین، بحوالہ سابقہ، ص ۲۸۷ -

۶۶ - ایضاً ص ۲۸۸ -

۶۷۔ وحید احمد (.ed) بحوالہ سابقہ، ۲۳ ستمبر ۱۹۳۵ء، ص ۱۷۷۔

۶۸۔ جمیل الدین احمد

Historic Documents of the Muslim Freedom Movement, Lahore, 1970, p. 231.

۶۹۔ اکرام علی ملک، بحوالہ سابقہ، ص ۵۰۳۔

۷۰۔ انقلاب، بحوالہ سابقہ، ۱۵ فروری ۱۹۳۸ء۔

۷۱۔ سکندر حیات کے بیان اور ملک برکت علی کے جواب کے لئے دیکھیے ایسٹرن ٹائمز، لاہور، ۱۷ مارچ ۱۹۳۸ء

۷۲۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ، بحوالہ سابقہ، ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء۔